⊙ ڈاکٹر الماس خانم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی لاہور
⊙⊙ ڈاکٹر سفیر حیدر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی لاہور

'ولیم': نوآبادیاتی عہد کا ایک جدلیاتی استعارہ
(بہ حوالہ: نولکھی کوٹھی)

Abstract:

Nau Lakhi Kotthi by Ali Akbar Natiq is a prominent novel of 21st Century. This Novel covers the Colonial and Post- Colonial Period. This Novel is based on a real character 'Wiliam' which can be considered a metaphor of Colonial Period. This was the era when the wave of independence in India was awakened and Queen Britain's grip was weakened. William's grandfather and father had ruled successfully over the Subcontinent. Now William wanted to rule here as commissioner. It was the time to fall of British Colonialism in Subcontinent. In the start of Novel, writer reflects the mentality of William which is basically reflection of all Britain. According to that mentality British wanted to rule here with full power. With the passage of time William becomes a sensitive person. William does not belong to British policies. He Loves Hindustan that's why at the time of independence he preferred to stay in Okara which is city of Pakistan. Purpose of this article is to highlight the features of this Novel specially to reflect the mentality of William who is the metaphor of Colonialism.

Keywords:

William Colonialism Natiq metaphor British Novel Fiction

''آزادی کے بعد جب تاریخ کو از سرِ نو تشکیل دیا جاتا ہے تو ان کے لیے نوآبادیاتی عہد

باعثِ ندامت اور شرم ہوتا ہے۔ یہ انہیں شکست کی یاد دلاتا ہے۔اس میں ان کی پس ماندگی، بے حسی اور بے چارگی چھپی ہوتی ہے۔اس میں ان کی غلامی کی زندگی پنہاں ہوتی ہے ۔ان حالات میں تاریخ کو دوطرح سے لکھا جاتا ہے: ایک تو یہ کہ ماضی سے سبق حاصل کیا جائے؟ اپنی شکست اور غلامی کا تجزیہ کیا جائے؟ اپنی پس ماندگی پر غور کیا جائے یا اپنی تہذیب وثقافت کو دیکھا جائے تا کہ ایسے حالات دوبارہ پیدا نہ ہوں کہ جو انہیں پھر پس ماندگی اور غلامی کی طرف لے جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس عہد اور دور کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے تا کہ شکست کا جو داغ ہے وہ نظر ہی نہ آئے۔‘‘(۱)

استعمار کے سادہ سے معنی یہی بیان کیے جاتے ہیں کہ زبردستی کسی کے حصہ پر قبضہ کرنا، نئی آبادی قائم کرنا، مقامی باشندوں کا استحصال کرنا اور انہیں غلامی، ذلت، رسوائی، اور ندامت کے گڑھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا اور اس سب کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ جبر، نفرت، حسد، لالچ، بے حسی، غاصبیت قرار دیے جا سکتے ہیں۔ایک انسان کے دوسرے انسان پر جبر، استحصال، نفرت، حسد سے قتل تک کی تاریخ کا آغاز جو کہ ہابیل اور قابیل کے واقعہ سے ہوتا ہے اگر اس واقعہ میں استعمار کی جڑیں تلاش کی جائیں تو بے جانہ ہوگا۔ قابیل کا لالچ، حسد، غاصبانہ سوچ، طاقت کا نشہ، دوسرے کی جاگیر پر قبضہ کی خواہش، ہابیل کے استحصال کی کوشش، ہابیل کو کم تر، کمزور ثابت کرنے کا جنون، یہی وہ منفی جذبات ہیں جنہوں نے ابتدائے کائنات سے آج تک کے انسان کو اپنے حصار میں لیے رکھا ہے۔خون ریز جنگوں سے لے کر کھوپڑیوں کے مینار تیار کرنے تک، دوردراز علاقوں کی زرخیز زمینوں اور گرم پانیوں تک رسائی پانے تک، انسان سے وحشی جانور بننے تک انسانوں میں یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔انہیں جذبات نے صدیوں کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آج کی ’مہذب اور ترقی یافتہ‘ دنیا میں کہیں ’نوآبادیات کے جبر واستحصال‘ کی شکل میں اظہار پایا اور کہیں ’دہشت گردی‘ کی اصطلاح کے طور پر متعارف ہوئے۔صدیوں کی مسافت کے بعد یہ انسان کی جبلت کا حصہ بن گئے ۔انہیں حیوانی جذبات نے اربوں کھربوں انسانوں کو بے بسی کی زندگی اور ذلت کی موت سے ہمکنار کیا۔ بنیادی طور پر یہی وہ جذبہ تھا جس نے ’استعمار‘ کو جنم دیا جس نے رفتہ رفتہ تمام دنیا میں اپنے خونین پنجے گاڑ لیے۔اسی استعماری ذہنیت کے نتیجے میں انسان نہ صرف انسانوں کے غلام بنے بلکہ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور بھی ہوئے اور جس کسی نے اس ذلت آمیز زندگی سے نجات پانے کے لیے بغاوت کرنے کی کوشش بھی کی وہ ایسی عبرت انگیز موت سے دوچار ہوا جس نے اس کی آنے والی نسلوں کو خوف کی حبس آلودہ فضاؤں میں سانسیں لینے پر مجبور کیے رکھا۔جس کے نتیجے میں غلاموں کی کئی نسلیں تیار ہوئیں اور مختلف طریقوں سے اپنے ’آقاؤں‘ کے جبر واستحصال کا شکار رہیں۔ مہذب دنیا میں ’آقاؤں‘ کے جبر واستحصال کے جدید حربوں نے جنم لیا جنہوں نے ’غلاموں‘ کے لیے نئے شکنجے تیار کیے۔آج بھی دنیا کی بیشتر آبادی ’آقاؤں‘ کی تیار کردہ جدید زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔’نوآبادکاروں‘ کے خونین پنجے آج بھی ’دیسی باشندوں‘ کی گردنوں میں گڑے ہوئے ہیں لیکن پہلے سے مختلف صورتوں میں۔

’استعمار‘ کی باقاعدہ اور باضابطہ تاریخ کا آغاز پندرہویں اور سولہویں صدی سے ہوا۔ جب توسیع پسندی اور

جغرافیائی تسلط نے منظّم انداز میں اپنی جڑیں مضبوط کیں۔فرانس،انگلینڈ، پرتگال،اسپین اور نیدرلینڈ نے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی وسیع سلطنتوں کی بنیادیں رکھیں۔یہی وہ دور تھا جب انگلستان 'سونے کی چڑیا' کو قید کرنے سات سمندر پار سے 'تجارت' کا مسحور کُن راگ الاپتا ہندوستان میں وارد ہوا اور کروڑوں انسانوں کو غلامی کا طوق پہنا کر جبر واستحصال کی ایسی داستان رقم کی جس کی بازگشت آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں سنائی دیتی ہے۔۱۹۴۷ میں جب انگلتان نے سرزمینِ ہند سے اپنی بساط لپیٹی تب تک اہلِ ہند کی کئی نسلیں غلامی کی چکی میں پس کر اپنی شکل،رنگ،روپ سب کھو چکی تھیں۔'نوآبادکاروں' نے صدیوں کی جکڑ بندیوں کے ذریعے 'دیسی باشندوں' کی شناخت،تہذیب،ثقافت،زبان یہاں تک کہ مذہب کی اصل شکل مسخ کرنے کا فریضہ ایسی مہارت سے انجام دیا جس سے آج تک نجات ممکن نہ ہوسکی۔ 'نوآبادکاروں' نے دنیا کے جس خطے میں بھی اپنے پنجے گاڑے وہاں کے 'دیسی باشندوں' کی ذات کی شکست وریخت اور شناخت کو مسخ کرنے کا یکساں کھیل کھیلا لیکن بالآخر صدیوں سے جاری اس مذموم کھیل کا خاتمہ ہوا اور پوری دنیا میں استعمار کے خلاف آوازیں گونجنے لگیں۔'دیسی باشندوں' نے ہر پلیٹ فارم پر 'استعمار' کے خلاف آواز بلند کی۔یہاں تک کہ ادب میں بھی استحصال کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ایڈورڈ سعید، بھابھا،فینن وغیرہ نے نوآبادیات اور مابعدنوآبادیات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔

بیسویں صدی کے نصف بعد سے اس موضوع نے ادب میں بھی اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔شاعری اورافسانوی ادب میں بھی ان موضوعات نے راہ پائی۔اردو ادب میں بھی اس موضوع پر شاعروں اور ادیبوں نے قلم فرسائی کی۔ 'نوآبادیاتی دور' میں ہی ایسی تحریریں سامنے آئیں جن میں 'نوآبادکاروں' کے ظلم واستحصال اور 'دیسی باشندوں' کی غلامانہ ذہنیت کو موضوع بنایا گیا۔آج دنیا میں 'نوآبادیات اور مابعدنوآبادیات' کا موضوع شاملِ نصاب ہو چکا ہے۔ایک طرف تو 'نوآبادکاروں' کے عہد کے جبر واستحصال کے ہتھکنڈوں پر تحقیق ہو رہی ہے اور دوسری طرف مابعدنوآبادیات کے مباحث زوروشور سے جاری ہیں۔آج جبکہ برطانوی استعمار کی بساط الٹے کئی عشرے بیت چکے ہیں لیکن بھارت اور پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادب میں آج بھی 'نوآبادیات اور مابعدنوآبادیات' کی گونج سنائی دیتی ہے۔اگر ''ابن الوقت'' (۱۸۸۸ء) کو اس موضوع کا پہلا اور نولکھی کوٹھی (۲۰۱۴ء) کو اب تک کا آخری ناول قرار دیا جائے تو ادب میں اس موضوع کی پیشکش کی عمر قریباً ۱۲۶ برس بنتی ہے۔اس دوران اس موضوع پر چند گنتی کے ناول ہی تخلیق ہوئے لیکن جتنے ناول بھی منظرِعام پر آئے ان میں اس موضوع کا حق ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

نولکھی کوٹھی کا موضوع ہندوستان کی سرزمین پر زوال آمادہ برطانوی سامراج ہے۔ناول میں جس دور کا ہندوستان پیش کیا گیا ہے وہ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ کے زمانے پر محیط ہے۔یہ وہی دور ہے جب ہندوستان میں برطانوی سامراج کی گرفت کمزور ہو رہی تھی اور آزادی کی کئی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ہندوستان میں استعمار کا جو کھیل کھیلا گیا وہ گورے اور کالے کھلاڑیوں کے تانے بانے سے تیار ہوا۔ایک طرف چند ہزار گورے کردار تھے جو کہ فوجیوں،ڈاکٹروں، مشنریوں اور اعلیٰ افسران کا لبادہ اوڑھے ہندوستان میں استعمار کی تقویت کے لیے وارد ہوئے اور دوسری طرف کروڑوں کالے کردار تھے جو صدیوں سے اس سرزمین پر راجوں،مہاراجوں،شہنشاہوں،سپہ سالاروں،نوابوں، جاگیرداروں،

پنڈتوں، عالموں اور عوامی بھیس میں بستے چلے آ رہے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان چند ہزار گورے اور کروڑوں کالے کرداروں میں بنیادی فرق کیا تھا کہ جس کی بنا پر چند ہزار کردار تو سات سمندر پار سے آ کر حاکم بن گئے جبکہ کروڑوں کالے مقامی خواص و عام غلام ٹھہرے۔ ایڈورڈ سعید نے ان کرداروں کے بنیادی فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی کتاب اورینٹلزم (Orientalism) میں لکھا ہے:

’’......ایک یورپ کا رہنے والا بہت استدلالی ہے۔ حقائق کے بارے میں اس کی بات ہر قسم کے ابہام سے مبرا ہوتی ہے۔ وہ جبلی طور پر منطقی ہے، خواہ اس نے منطق کی تعلیم حاصل کی ہو یا نہ کی ہو۔ تشکیک اس کی فطرت میں ہے اور کسی کا دعویٰ، نظریہ یا بات کو قبول کرنے سے پہلے ثبوت کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی تربیت یافتہ سمجھ بوجھ، مشین کی طرح کام کرتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مشرقی آدمی کا ذہن اس کی سجی سجائی گلیوں کی طرح تناسب کے احساس سے عاری ہوتا ہے۔ اس کا استدلال گنجلک اور بے ترتیب ہوتا ہے۔‘‘(۲)

گویا کہ ایڈورڈ سعید کے نزدیک ’گورے‘ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ’اس کی تربیت یافتہ سمجھ بوجھ، مشین کی طرح کام کرتی ہے‘ اور ’کالے‘ کی خامی یہ ہے کہ ’اس کا استدلال گنجلک اور بے ترتیب ہوتا ہے‘۔ یہی وجہ ہے کہ چند ہزار تربیت یافتہ سمجھ بوجھ والے عالی دماغ، کروڑوں گنجلک اور بے ترتیب ذہنوں پر غالب آ گئے۔ نو لکھی کوٹھی میں بھی علی اکبر ناطق نے ایسے کئی کردار پیش کیے ہیں جو ’گوروں‘ اور ’کالوں‘ کے نمائندہ کردار ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ’ولیم‘ ہے۔ ناول میں ولیم نوآبادیاتی دور کا جدلیاتی استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ولیم نوآبادکاروں کا ایسا کردار ہے جس کے آباؤ اجداد کو ہندوستان کی سرزمین پر راج کرتے ہوئے ایک صدی سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ ہندوستان کا علاقہ ’گوگیرہ‘ ولیم کے پردادا کے نام پر آباد ہوا۔ ولیم کے دادا ہالرائیڈ کے مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں بلوے میں قتل کے بعد اس کا باپ جانسن ڈپٹی کمشنر بنا اور اب وہ بطور اسسٹنٹ کمشنر ہندوستان کی سرزمین پر حکومت کرنے کے خواب آنکھوں میں سجائے انگلستان سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد ہندوستان لوٹا تھا۔ یہ وہی دور تھا جو ہندوستان میں برطانوی سامراج کے زوال کا دور تھا۔ ناول کی کہانی کا آغاز انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد ولیم کی ہندوستان واپسی سے ہوتا ہے۔ ولیم کا بچپن لاہور میں گزرا۔ اب وہ آٹھ سال کے عرصہ کے بعد ہندوستان لوٹا تھا۔ علی اکبر ناطق نے ولیم کی ذہنیت کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

’’آج جب وہ اسسٹنٹ کمشنر بننے کے لیے امتحان پاس کر کے ہندوستان میں داخل ہو رہا تھا تو کیسا سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا دیسی لوگوں پر حکومت کرنے میں کتنا مزہ ہے۔ اِدھر انگلینڈ میں تو کوئی تمیز ہی نہیں۔ سب کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتے ہیں۔ کھٹ بھیے اور بھنگی تک بات نہیں سنتے۔ مگر جیسے ہی ہندوستان کی ہوا لگتی ہے، بندہ ایک دم نواب ہو جاتا ہے۔ زندگی کا لطف تو بس ہندوستان کے لوگوں ہی میں ہے۔ اس نے سوچا، اب میں کبھی انگلستان کا منہ نہیں

دیکھوں گا۔ دوسال بعد کیتھی کو بھی بلالوں گا۔ پھر ساری عمر مزے سے کمشنری کریں گے''۔ (۳)

یہ وہ ذہنیت ہے جو اُس عہد کے ہر ایک 'ولیم' کی برطانوی پالیسی کی عکاس تھی۔ یعنی نوابانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ کمشنری کے مزے لوٹتے ہوئے 'دیسی باشندوں' پرنسل درنسل حکومت کرتے چلے جانا۔ اقتدار کے نشے میں چُور 'ولیم' شاید زوال کی اس آواز کو سننا ہی نہ چاہتے تھے جو کہ برطانوی استعمار کے دروازے پر ہولے ہولے دستک دے رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولیم ۱۹۴۷ء کے بعد بھی انگلستان واپس جانے کو رضامند نہ ہوا اور ہندوستان میں اپنے دادا کی بنائی ہوئی کوٹھی میں زندگی کے آخری مراحل گزارنے کو ترجیح دی۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو اوکاڑہ کے قرب وجوار میں 'نولکھی کوٹھی' کے نام سے مشہور تھی۔ علی اکبر ناطق نے ناول کا نام ولیم کے دادا کی بنائی ہوئی اسی کوٹھی کے نام پر رکھا۔ ناول میں اس کوٹھی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

''دادا کہا کرتے تھے، بھلے وقتوں میں اس پر نولاکھ خرچ آیا تھا۔ جیسی بنگلے کی شان تھی، خیال ہے یہ بھی کم بتاتے تھے۔ انہوں نے اس کوٹھی کا نام 'نولکھی کوٹھی' رکھ دیا تھا''۔ (۴)

یہی وہ کوٹھی ہے جس کے قرب وجوار میں ناول کے مرکزی کردار ''ولیم'' کے حقیقی کردار سے علی اکبر ناطق کی ملاقات ہوئی۔ اور یہی ملاقات اس ناول کی تخلیق کا باعث بنی۔ یہ قریباً ۱۹۸۹ کے لگ بھگ کا زمانہ تھا جب سابقہ کمشنر ولیم سے علی اکبر ناطق کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا جو نقشہ علی اکبر ناطق نے ناول میں کھینچا ہے وہ برطانوی استعمار کے ایک جاندار کردار کا مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ منظر دیکھیے:

''نیچے اترا تو میری نظر ایک مجمعے پر پڑی، جو ایک بہت پرانے پیپل کے درخت کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ لوگ آرے اور کلہاڑوں سے پیپل کے اردگرد گڑھا کھود کر اس کے تنے کو کاٹنے کے درپے تھے، جبکہ ایک بوڑھا انگریز اس گڑھے میں بیٹھا، ان کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ دو آدمی اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش میں تھے لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے لوگ اس کھینچا تانی کے عمل سے اردگرد کھڑے محظوظ ہو رہے تھے۔ وہ نہ تو بڈھے کی طرف داری کر رہے تھے، نہ ان دو آدمیوں کو روک رہے تھے، جو بوڑھے کو بے دردی سے باہر کھینچنے میں لگے تھے اور اسے پنجابی میں سخت سست کہہ رہے تھے...... اس عمل میں اس بوڑھے انگریز کا ہیٹ پاس ہی گیلی مٹی میں مُرا تڑا پڑا تھا...... بوڑھے کی رنگت بہت زیادہ سرخ اور سفید تھی۔ لیکن یہ وہ سرخی نہیں تھی، جو خون اور جوان صحت کی نشانی ہوتی ہے۔ بلکہ یہ رنگت نسل اور قوم کا پتہ دینے والی تھی''۔ (۵)

یہ وہی 'سفید رنگت' تھی جو صدیوں پہلے سات سمندر پار کر کے سونے کی چڑیا ہندوستان کی 'سیاہ رنگت' پر حکومت کرنے آئی تھی اور جس نے کئی صدیوں تک 'دیسی باشندوں' پر اس طرح حکومت کی تھی جس طرح جانوروں پر حکومت کی جاتی ہے۔ یہ سرخ وسفید بڈھا جس کی ذلت کا منظر علی اکبر ناطق کی نظروں کے سامنے تھا یہ وہی 'ولیم' تھا جو چھ (۶) دہائیاں

قبل انگلستان سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد آنکھوں میں ہندوستان پر حکومت کے خواب لے کر لوٹا تھا اور جس نے قریباً تین عشروں تک ہندوستان پر طمطراق سے حکومت کی تھی۔ یہ وہی ولیم تھا جس کا کئی نسلوں کے بعد انگلستان کی سرزمین سے واجبی سا رشتہ ہی رہ گیا تھا۔ جس نے ہندوستان کی سرزمین پر آنکھ کھولی تھی۔ جس کا بچپن آم کے بُور سے لدے آموں کی چھاؤں میں بسر ہوا تھا اور آموں کے بُور کی خوشبو نے انگلستان میں بھی اس کو مسحور رکھا تھا۔ انگلستان میں آٹھ سالہ قیام کے دوران وہ کبھی بھی اس سرزمین کے سحر سے آزاد نہ ہونے پایا تھا اور ہندوستان کی سرزمین سے ولیم کی یہ محبت اس جیسی سفید رنگت والے حاکموں کو کھٹکتی تھی کیونکہ ان کی حاکمانہ ذہنیت کسی بھی 'ولیم' کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سرزمین کے سحر میں گرفتار ہو کیونکہ 'سفید رنگت' سات سمندر پار سے یہاں 'سیاہ رنگت' والوں پر حکومت کرنے آئی تھی نہ کہ ان کی زمین سے محبت کرنے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی 'ولیم' سرزمینِ ہندوستان کی محبت میں گرفتار ہونے لگتا ہے اور اس سرزمین کے باشندوں کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرتا ہے۔ 'سفید رنگت' والوں کی طرف سے اسے تنبیہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ اس کے والد جانسن بھی اس کی اس دردمندی کو 'سفید رنگت' والوں کی شان کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ جانسن اپنے بیٹے کے لیے فکرمند ہیں جو کہ انگریز سرکار سے زیادہ ہندوستان سے وفادار ثابت ہو رہا ہے۔ وہ اسے بار بار اپنے خاندان کی خدمات کا حوالہ دیتے ہیں اور اس دوران بھی حاکمانہ ذہنیت بھرپور انداز میں منعکس ہوتی ہے:

> 'جانسن نے بلا کسی تمہید کے بات شروع کی، ولیم یہ ڈرائنگ روم میں جتنی تصویریں دیکھ رہے ہو، یہ سب آپ کے اجداد کی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جس کی خدمات خاندان اور گورنمنٹ کے لیے یکساں فخر کا باعث نہ ہوں۔ یہ ہندوستان، جس کے رومان میں آپ مبتلا ہو، یہ ہمیں بھی اتنا ہی اپنی طرف کھینچتا ہے جتنا آپ کو، لیکن اس کی محبت کے کچھ آداب ہیں اور وہ آداب تمہارے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے، کالے اور سفید لوگوں کے درمیان ایک لکیر ہے۔ اسے جب بھی عبور کیا جائے گا، اسی وقت یہ زمین اپنے گلے سے ہمارے اقتدار کی رسی کاٹ دے گی۔ میں بھی اس حق میں ہوں کہ کالوں کی غربت اور جہالت ختم ہونی چاہیے۔ اسے بہت حد تک ہم نے ختم کیا بھی ہے، لیکن کیا آپ اس بات کو بھول گئے کہ ہماری ان پر حکومت کا سبب ان کی یہی جہالت ہے۔ چنانچہ اسے ایک حد تک ان پر مسلط رکھنا ضروری ہے۔''(۶)

جانسن کا یہ مکالمہ اسی ذہنیت کا عکاس تھا جس کا اظہار جے ایس مل نے اپنے مقالات میں کیا تھا ''کہ اس کے نظریات اور خیالات ہندوستان میں قابلِ اجرا نہیں ہیں، کیونکہ اہلِ ہند نسلی لحاظ سے نہ سہی تہذیبی لحاظ سے گھٹیا ہیں''(۷) اور اسی گھٹیا پن سے اس جہالت نے جنم لیا جو ہمیشہ مہذب فرنگی کے لیے دردِ سر بنی رہی۔ اسی طرح ولیم جب ہندوستان تعیناتی کے بعد ڈپٹی کمشنر ہیلے سے پہلی ملاقات کرتا ہے تو اس ملاقات میں ڈپٹی کمشنر ہیلے ولیم کی بطور حاکم جن دو خطرناک قباحتوں کی

نشاندہی کرتا ہے وہ اس مکالمے سے عیاں ہیں:

’’آپ کے متعلق میرے پاس خاصی معلومات ہیں، جو ہندوستان میں رہنے والے ایک انگریز افسر کے لیے خطرناک ہیں۔ رپورٹ کے مطابق آپ کمشنری کے لیے مناسب نہیں تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کے مزاج میں شوریدگی اور بعض شاعرانہ قباحتیں ہیں۔ لیکن ہوم منسٹری نے آپ کے اجداد کی سابقہ خدمات کے پیشِ نظر اُس رپورٹ کو نظرانداز کر دیا اور پوسٹنگ لیٹر دے کر بھیج دیا۔ اب اُس رپورٹ کو غلط ثابت کرنا آپ کے ذمہ ہے۔‘‘(۸)

ناول میں ڈپٹی کمشنر ہیلے کا کردار حاکمانہ ذہنیت کا مضبوط ترین کردار ہے جو ولیم کی ’برین واشنگ‘ کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ ہیلے وہ کردار ہے جو برطانوی سامراج کی صدیوں کی حاکمانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہیلے ایک اور مقام پر ’ولیم‘ کو اان الفاظ میں سرزنش کرتا ہے کہ:

’’ہیلے نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے دوبارہ گفتگو شروع کی، ولیم، تم ایک انگریز ہو۔ یہاں تمہاری حیثیت ایک حاکم کی ہے۔ ہم یہاں کی زمین سے رومانس نہیں، حکومت کرنے آئے ہیں۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے، آپ کی شاعرانہ طبیعت آپ کو مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ یہاں آپ کا وجود برتر سطح پر ہے۔ اس لیے آپ پر کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو انگریز نوجوان برٹش سول سروس کو جوائن نہیں کرتے وہ ان حدود اور ذمہ داریوں سے ماورا ہیں۔ ولیم حاکم اور محکوم میں ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ اسے قائم رکھنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔‘‘(۹)

ہیلے ایک اور مقام پر کہتا ہے:

’’ولیم تمہیں انگلستان کی برف ہندوستان کے گرم دریاؤں سے اور لندن کے سفید کوے آگرہ کے کبوتروں سے زیادہ عزیز ہونے چاہییں۔‘‘(۱۰)

’سفید رنگت‘ والوں کے نزدیک ولیم کی ہندوستان سے محبت اور شاعرانہ مزاجی دونوں بہت بڑی قباحتیں ہیں۔ ولیم ایک حساس انسان ہے جو بقول ہیلے شاعرانہ قباحتوں کا مالک ہے۔ اس کی طبیعت میں بغاوت ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ ولیم ایک ایسا کردار ہے جسے انگریزوں کی پالیسی سے کچھ خاص سروکار نہیں ہے۔ ہندوستان کی محبت اس کے وجود میں ایسی بسی ہوئی ہے جس نے اسے انگریز کی صدیوں سے رائج خاص پالیسیوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ولیم کے کردار، اس کی سوچ کی عکاسی، علی اکبر ناطق نے ان الفاظ میں کی ہے:

’’مگر اس سب کے باوجود ولیم نے اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ اپنے اصول اور ضابطے الگ سے بنائے گا چاہے وہ ضابطے انگریزی حکومت کو خوش نہ بھی آئیں۔‘‘(۱۱)

یہ سوچ صرف ایک ’ولیم‘ کی سوچ نہیں بلکہ یہ وہ سوچ ہے جس نے کئی نسلوں کی حاکمانہ ذہنیت کے بعد اس دور کے مختلف

کرداروں میں نمو پائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نولکھی کوٹھی میں اکثر مقامات پر ولیم دیسی باشندوں کے درد کو محسوس کرتا ہے وہ ان کی جہالت اور غربت پر کُڑھتا ہے اور ان کے خاتمے کی کوشش میں رہتا ہے۔ اس کا اظہار ناول میں کئی مقامات پر ہوا ہے:

''ولیم نے سوچا، کاش حکومت برطانیہ دولت سمیٹنے کے علاوہ بھی کچھ کام کر سکتی۔ اسے اس علاقے کا بنجر پن دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔'' (۱۲)

''جیپ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ولیم کا دماغ بھی دوڑ رہا تھا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے کاندھوں پر کس قدر بھاری ذمہ داری تھی۔ پورے علاقے کی معاشی اور تعلیمی حالت انتہائی ناگفتہ بہ اور اس پر لڑائی فساد اور ڈکیتی کے کئی واقعات، سینکڑوں مسائل تھے۔ خاص کر دیہاتی علاقوں کی کسمپرسی دل دہلا دینے والی تھی۔ کرنے کے بہت سے کام تھے اور وسائل کم۔ لیکن اگر وہ ان سب کو نظر انداز کر کے سابقہ افسروں کی طرح دفتر میں بند ہو جائے تو سب کچھ خود بخود آسان تھا۔ یہ سوچ کر اس نے جھرجھری لی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اب تو ہندوستان اس کا اپنا ملک تھا۔ پچھلی چار نسلوں سے اُس کا خاندان اسی مٹی سے اپنا رزق اٹھا تا رہا اور اب تو اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون یہیں کے پانی اور سبزے سے تیار ہوا تھا۔ اسے لندن سے صرف اتنی ہمدردی تھی جتنی ڈیڑھ سو سال کے مہاجرین کی نسلوں کو اپنے سابقہ وطن سے ہو سکتی ہے۔ ولیم نے اپنی زندگی کے بیشتر سال لاہور کے مال روڈ اور منٹگمری کی نہروں کے کناروں پر دوڑتے ہوئے گزارے تھے۔ اس نے سوچا اس کا دادا یہیں پیدا ہوا، باپ نے یہیں پر جنم لیا اور وہ خود اسی مٹی سے پھوٹا۔ اب کون ہے، جو اسے کہے کہ ہندوستان اس کا اپنا ملک نہیں ہے۔ وہ ہر حالت میں یہیں رہے گا اور انہی لوگوں کے لیے کام کرے گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔'' (۱۳)

ولیم دیسی لوگوں کے لیے ایک انگریزی اسکول قائم کرنے کا خواہش مند ہے۔ شاید بچپن سے وہ یہ سوچتا آ رہا ہے کہ دیسی لوگوں کی جاہل اولادیں کچھ پڑھ کر اپنی حالت سدھارنے کے قابل ہو سکیں۔ جب وہ اپنے ان خیلات کا اظہار اپنی والدہ حنا کے سامنے کرتا ہے تو وہ جن خدشات اور خیالات کا اظہار کرتی ہے وہ حاکم ذہنیت کے عکاس ہیں:

''حنا نے ایک نظر ولیم کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی میرا خیال ہے تمہیں کیتھی سے زیادہ ان کالوں کی فکر ہے۔ تم ان کے بارے میں حاکم بن کر کیوں نہیں سوچتے؟ خداوند یسوع مسیح نے تم پر ایک برکت نازل کر کے کمشنر بنا دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی برکت واپس لے لے اور تم انہی کالوں کے ساتھ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ۔ کیونکہ انہیں ایسی حالت میں ہم نے نہیں خداوند یسوع مسیح نے رکھا ہے۔ اب ان کو نہ یسوع مسیح جانتا ہے اور نہ یہ اس کو جانتے ہیں۔ اس لیے ان سے دور رہو اور خدا کی برکتوں کو ضائع نہ کرو۔ جانسن صاحب تمہارے بارے میں بہت فکر مند ہیں وہ کہہ رہے

تھے فیروز پور سے بھی ان کی رپورٹس اچھی نہیں آ رہیں اور یہ کہ ولیم گورنمنٹ سے زیادہ رعایا کا وفا دار ہے۔اس بات کے اثرات اس کی ملازمت پر برے پڑیں گے۔''(۱۴)

'ولیم' ایک ایسا کردار ہے جس کی جڑیں انگلستان میں ہیں جب کہ شاخیں ہندوستان میں۔وہ ہمہ وقت دو کشتیوں میں سوار دکھائی دیتا ہے۔ایک طرف اس کی حاکمانہ جبلت ہے جو 'دیسی باشندوں' کے سامنے اسے 'عظیم ہندوستان' کی عظمت کے ستون بلند رکھنے پر مجبور رکھتی ہے اور دوسری طرف اس کی جائے پیدائش ہندوستان کی سرزمین ہے جس کی محبت اس کی رگوں میں دوڑتی پھرتی ہے۔ناول میں 'ولیم' کبھی تو برطانوی استعمار کے نمائندہ کردار کے طور پر ابھرتا ہے اور کبھی ہندوستان کی محبت کے خمیر میں گندھے ہوئے دردمند انسان کے طور پر۔لیکن اس دردمندی میں بھی وہ یہ کبھی فراموش نہیں کر پاتا کہ وہ عظیم برطانیہ کا ایک ایسا طاقتور مہرہ ہے جو برطانیہ کی عظمت کا امین ہے اسی لیے اکثر مقامات پر اس کی حاکمانہ ذہنیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔جیسے ہی جنگِ عظیم دوم کے نتیجے میں ہندوستان میں انگریزوں کی گرفت کمزور ہونے لگتی ہے اور آزادی کی تحریک زور پکڑتی ہے اور ولیم سمیت تمام انگریز حاکموں کو ہندوستان ریت کی مانند اپنی مٹھی سے نکلتا محسوس ہونے لگتا ہے تو ولیم کی ذہنی کشمکش عروج پر پہنچ جاتی ہے، وہ عجیب کرب اور اذیت سے دوچار ہونے لگتا ہے۔حکومت کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر اس کی رگوں میں دوڑتا حاکمیت کا لہو جوش مارنے لگتا ہے۔اس بدلتی ہوئی صورتحال کے ساتھ ساتھ ولیم کی بدلتی ہوئی ذہنی حالت کی عکاسی علی اکبر ناطق نے کمال مہارت سے کی ہے:

''ولیم کو بعض اوقات ان سے وحشت معلوم ہوتی۔ولیم کو اس بات پر شدید غصہ آتا کہ ان کے بڑے اصل میں انگریزوں کو نکال کر اپنی حکومت چاہتے ہیں۔اس کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے آنے شروع ہو جاتے وہ سوچتا، کیا یہ ہندوستانی اسے بھی نکال دیں گے؟ حالانکہ ان کے خاندان کو یہاں پورے ڈیڑھ سو سال ہو گئے ہیں۔بعض اوقات ولیم دل کو دلاسہ دینے کے لیے کہتا، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔جو حکومت اتنی جدوجہد اور طاقت سے حاصل کی گئی ہے، اسے انگریز اتنی آسانی سے ان گنواروں کے سپرد نہیں کریں گے۔جن کے پاس نہ تعلیم ہے اور نہ حکومت چلانے کا تجربہ۔''(۱۵)

ناول نگار ایک ماہر نفسیات کی طرح ولیم کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔یہاں ولیم محض ایک فرد نہیں رہتا بلکہ اس پس منظر میں علی اکبر ناطق نے حاکم ذہنیت کو اجاگر کیا ہے جس کا شکار برطانوی حکومت کا ہر عہدہ دار تھا جو حکومت کو اپنے ہاتھ سے نکلتا محسوس کر رہا تھا لیکن بے بس تھا:

''ان حالات میں ولیم کی ذہنی کیفیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ قریب کے جاننے والوں کو اس پر شبہ ہونے لگا، کہیں پاگل نہ ہو جائے۔بات بات پر الجھنا، احکام دیتے ہوئے تحمل کو چھوڑ بیٹھنا اور بعض اوقات سامنے والے کو گالی بھی دے دینا ولیم کی عادات میں شامل ہو رہا تھا۔اس بات کی

سب سے زیادہ تشویش کیتھی کو تھی، جو سب سے زیادہ یہ عذاب جھیل رہی تھی، مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی، اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ یہ سب کچھ ولیم سے مستقبل میں پیدا ہونے والے حالات کے پیشِ نظر ہو رہا ہے۔ ولیم کے ہاتھ سے اختیارات کی ڈور روز بروز نکلتی جا رہی تھی اور گورنمنٹ کی طرف سے وصول ہونے والے ہر نئے حکم پر اس کے چڑ چڑے پن میں اضافہ ہو جاتا، جو کئی دن تک برقرار رہتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا، ہٹلر نے گورنمنٹ برطانیہ کی ہڈیوں کا تمام گودا کھینچ لیا ہے اور اب ان کے پاس نوآبادیات میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی نہ طاقت ہے اور نہ ہی جواز۔''(۱۶)

ہندوستان پر انگریز کا کنٹرول ختم ہونے لگا تھا ان کے وسائل جنگ کی بھٹی میں جھونکے جا چکے تھے ۔ ہندوستان کے لوگ جاگ گئے تھے ولیم کے لیے یہ ساری صورتحال نہ صرف یہ کہ نا قابلِ برداشت تھی بلکہ اذیت ناک بھی تھی ۔ ایک طرف حکومت کے ہاتھ سے جانے کا غم اور دوسری طرف ہندوستان کی سرزمین کو چھوڑنے کا اندیشہ ان سب حالات نے مل کر ولیم کو عجیب کرب سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ٹھیک اسی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا جس طرح برطانیہ کی حکومت:

''ان باتوں کے علاوہ جو مشکل سب سے اہم تھی وہ یہ کہ اب ہندوستانی بھی پہلے والے نہیں رہے تھے۔ اب یہ لوگ چالاکی اور عیاری میں گوروں کے بھی کان کاٹتے تھے اور اس چکر میں تھے، کب انگریز یہاں سے نکلیں۔ ایسے میں انہیں آزاد کرنا ایسے ہی تھا، جیسے بغیر ہتھیار کے بھیڑیے کے ساتھ رات گزاری جائے۔ اس ساری صورتحال میں ولیم نہ صرف یہ کہ ہندوستانیوں سے بلکہ انگریزوں سے اور اپنے آپ سے بھی ناراض تھا۔ وہ یہ سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت تو اسے اور بھی غضب آتا، جب وہ کسی انگریز کو ہندوستان چھوڑنے سے متعلق گفتگو کرتے دیکھتا، یا اسے پتہ چلتا، اس کا فلاں دوست اپنا بوریا بستر سمیٹ کر انگلستان جا رہا ہے۔ ولیم کا اس وقت خون کھولنے لگ جاتا گویا یہ سب اس کے خلاف سازش تھی جس میں انگریز، مسلمان، ہندو سب شامل تھے۔''(۱۷)

حکومت کی طرف سے ہندوستان چھوڑ دینے کے متعلق احکامات ملنے کے بعد تو ولیم کی ذہنی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہ اذیت ناک حقیقت نا قابلِ قبول تھی کہ 'گوروں' کے اقتدار کا نہ صرف خاتمہ ہو گیا ہے بلکہ یہ اقتدار اب گنوار، جاہل اور اَن پڑھ کالوں کو منتقل ہونے جا رہا تھا۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر جانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا اور اپنی اس حالت کا ذمہ دار گوروں اور کالوں دونوں کو قرار دیتا تھا۔ وہ جو مضبوط اعصاب اور عظیم شخصیت کا مالک تھا اب بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ اب وہ صرف ایک ولیم نہ تھا بلکہ نوآبادیاتی عہد کا ایک استعارہ تھا۔ علی اکبر ناطق نے اس شکست خوردہ کردار کی عکاسی کمال مہارت سے کی ہے۔ دو اقتباسات ملاحظہ کریں:

''حالات روز بروز ولیم کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ اسے کبھی عزت و آبرو کو تباہ کر دینے والی جنگ کے متعلق سوچنے پر کوفت ہوتی۔ جس نے پانچ سال میں ہر شے راکھ کر ڈالی تھی، کبھی ہندوستانیوں کی بے وفائی اور احسان فراموشی پر غصہ آتا، جنہیں تعلیم دینے سے لے کر اور عقل سکھا کر جدید دور میں داخل کرنے تک صرف انگریز ہی کا کردار تھا۔ ورنہ یہ گنوار کے گنوار ہی رہتے...... جہاں ولیم ایک طرف ہندوستانیوں پر بھرا بیٹھا تھا، وہیں اپنی برٹش ایمپائر کے کرتا دھرتاؤں پر سخت غصہ میں تھا، جو آئے دن اختیارات ہندوستانیوں کو سونپتے رہے، اپنے ہاتھ کاٹتے رہے اور آج اسی کے نتیجے میں ہندوستان کو چھوڑ دینے پر مجبور تھے۔'' (۱۸)

''کیتھی تمہیں پتہ ہے؟ میں ولیم اپنے خاندان میں سب سے زیادہ بدقسمت انسان ہوں۔ میرا پردادا، میرا دادا اور میرا باپ بڑے خوش قسمت تھے۔ بڑے ذی اقتدار تھے اور بڑے معزز تھے۔ نہ انہیں وقت نے دھوکا دیا نہ انہوں نے وہ کرب محسوس کیا جو میرے حصے میں آیا ہے۔ وہ سب اسی ہندوستان کی مٹی میں اپنی مرضی سے رہے، اپنی مرضی سے یہیں دفن ہوئے۔ لیکن میں، جسے ان سب سے زیادہ ہندوستان سے محبت ہے۔ ان سب سے زیادہ میں اس مٹی میں اپنی روح محسوس کرتا ہوں اور ان سب سے زیادہ میری خواہش اسی سرزمین پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی ہے، میرے ہی ہاتھ سے وقت سرکتا جا رہا ہے۔ اس زمین کی مٹی میرے رنگ اور نسل کو اپنے سے علیحدہ کر کے مجھے باہر پھینکنے کی کوشش میں ہے۔ مجھے آئے دن ایسے احکامات وصول ہوتے ہیں، جو ہر اگلے لمحے ہندوستان سے میرا فاصلہ بڑھا رہے ہیں۔ میرا باپ ایک سال پہلے اور میری ماں ڈیڑھ سال پہلے بغیر کچھ تکلیف اٹھائے مر گئے اور یہیں دفن بھی ہو گئے مگر مجھے کہا جا رہا ہے کہ اپنا وجود یہاں سے سمیٹنا شروع کر دوں، یہ ہماری سرزمین نہیں ہے۔ آخر یہ کیا حماقت ہے؟'' (۱۹)

نوآبادیاتی عہد کے دیگر کرداروں کی طرح ولیم بھی بہت عرصہ شدید تذبذب کا شکار رہتا ہے کہ آیا وہ یخ بستہ برفیلی ہواؤں کا مقابلہ کرنے اپنے آباؤ اجداد کے وطن انگلستان واپس چلا جائے جس کے ساتھ اس کی کسی قسم کی جذباتی وابستگی نہیں ہے یا نہروں اور باغات کی اس سرزمین پر اپنا بڑھاپا گزارنے کا فیصلہ کر لے کہ جہاں اس کا بچپن اور جوانی گزرے ہیں اور اس کے ماں باپ دفن ہیں۔ اس کٹھن فیصلے کی راہ میں انگلستان کہیں بھی حائل نہیں اگر کوئی حائل ہے تو اس کی محبوب بیگم کیتھی اور اس کے جوان ہوتے بچے۔ علی اکبر ناطق نے ولیم کو اس کی زندگی کے فیصلہ کن موڑ تک یوں پہنچایا ہے:

''کیتھی، ولیم دوٹوک بولنے لگا، مجھے پورے ہندوستان سے کوئی لینا دینا نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ بس اس وقت جس جگہ تم اور میں کھڑے ہیں، مجھے اسی سے مطلب ہے۔ یہ جگہ، یہ خطہ، یہ نولکھی کوٹھی، یہ نہریں یہ باغات اور نہروں کی کچی کچی روشیں، کھیتوں میں اگتے ہوئے آلو،

مکئی، گندم، گنا اور برسن کے ٹھنڈے ٹھنڈے لمس، ان باغات اور نہروں کے مضافات میں رہنے والے لوگ، ان کے معصوم، سادہ اور عزت و آبرو بخشنے والے چہرے، یہ میری زندگی ہے۔'' (۲۰)

علی اکبر ناطق نے اس ناول کے تانے بانے کمال مہارت سے بنے ہیں۔ مقامیوں کو اقتدار کی منتقلی اور تقسیم کے بعد کے حالات کی عکاسی بھی خوب کی ہے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد بھی ولیم شاید لاشعوری طور پر اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اُن کی ایمپائر کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ہندوستان سے ان کی حاکمیت کی بساط لپیٹی جا چکی ہے۔ وہ ابھی بھی اس خوش گمانی میں مبتلا ہے کہ سفید رنگت حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اسی لیے اسے امید ہے کہ پاکستان میں سول سروس کا حصول اس کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ لیکن اس کی امیدوں پر بہت جلد پانی پھر جاتا ہے جب اسے پاکستان میں سول سروس میں لینے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ اپنی تمام تر توجہ اپنی نولکھی کوٹھی اور زمینوں کی دیکھ بھال کی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ اس کی بیوی، بچوں کے ہمراہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ اب اس کا اپنے خاندان سے کوئی تعلق ہے نہ رابطہ۔ رفتہ رفتہ وہ خود کو مقامی لوگوں کے رنگ میں ڈھال لیتا ہے اور ان کے ساتھ دیہی زندگی کا مکمل لطف لینے لگتا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ وہ کافی حد تک سیاہ رنگت والوں کے رنگ میں رنگا جا چکا ہے۔ صرف اس کی سفید و سرخ چمڑی اس کے انگلستان کے ساتھ کسی تعلق کی قدیم کہانی سناتی ہے۔ وہ اس حال میں خوش ہے۔ ضیاالحق کے دور میں وہ ایک بار پھر قیامت سے گزرتا ہے جب اس کی نولکھی کوٹھی جس کے عشق میں گرفتار ہو کر اس نے اپنے بیوی بچے اور آبائی وطن کی محبت کو قربان کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا اس سے چھین کر ایک با اثر مذہبی و سیاسی شخصیت کے نام الاٹ کر دی جاتی ہے۔ ناول نگار نے اس منظر کو کمال مہارت سے قرطاس پر کھینچا ہے۔ نوآبادیاتی دور کے زندہ کردار 'ولیم' سے ناول نگار کی شناسائی اس وقت ہوتی ہے جب پرانے درختوں کو کاٹا جا رہا ہوتا ہے اور ایک سرخ و سفید بوڑھا درخت کے تنے سے لپٹا اس کے اور اس کے کاٹنے والوں کے دوران شدید مزاحمت کر رہا ہوتا ہے کیونکہ وہ بوڑھا اس مٹی کی محبت میں گرفتار ہے جس پر حکومت کرنے اس کے آباؤ اجداد اور خود وہ آیا تھا۔ ناول میں بوڑھے ولیم کے اس مکالمے میں وہ محبت نہاں ہے جس سے وہ اس بڑھاپے میں بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں:

''اس قسم کے سوالوں سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ برطانیہ سے میں واقف نہیں ہوں۔ میں اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ آپ سے اور آپ کے باپ سے پہلے میں اس جگہ کو جانتا ہوں۔ شاید آپ کا دادا بھی یہاں کا نہیں ہوگا۔ یہ جگہ اس نے دیکھی بھی نہیں ہوگی۔ جب میں ان سب سے یہاں کا پرانا رہنے والا ہوں، تو یہاں سے کیوں جاؤں۔'' (۲۱)

بلا شبہ ہماری تاریخ کے کئی واقعات گوروں کی اس محبت کے آئینہ دار ہیں جس میں وہ کسی نہ کسی صورت گرفتار ہوئے۔ وہ ہندوستان کے حسن کے اسیر رہے، جیمز ایچلز کرک پیٹرک کی داستان ہو جسے ولیم ڈیلرمپل نے وائٹ مغل میں رقم کیا یا ہندوستان کی مٹی اور آم کے باغات کی محبت میں گرفتار ولیم کی داستان ہو جسے علی اکبر ناطق نے

نولکھی کوٹھی میں قلم بند کیا ہے، یہ داستانیں بھی گوروں کے ظلم وستم کی اُن داستانوں کی طرح اہم ہیں جو ہماری سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ نولکھی کوٹھی کے اس مرکزی کردار کے بارے میں جب علی اکبر ناطق سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے اسے ایک اساطیر قرار دیتے ہوئے کہا:

''کسی بھی ناولسٹ کے کردار اس کے اساطیر ہوتے ہیں اور کردار کا اساطیر بن جانا ہی آرٹ ہے۔ ولیم میرے ناول کا ایک ایسا ہی اساطیر ہے جسے آپ جب چھولیں گے تو کردار کا طلسم ختم ہو جائے گا۔ اس لیے میں اپنے اس کردار کو آپ کو چھونے نہیں دینا چاہتا اور کوئی بھی آرٹسٹ ایسا نہیں کر سکتا۔ باقی آپ جو چاہیں اس کے بارے میں لکھ دیں وہ صحیح ہوگا۔''**(۲۲)**

حواله جات

۱۔ مبارک علی، برطانوی راج (ایک تجزیہ)، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲) ص ۱۱

۲۔ ایڈورڈ ڈبلیو سعید، شرق شناسی، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵)، مترجم: محمد عباس، ص ۴۴

۳۔ علی اکبر ناطق، نولکھی کوٹھی، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴) ص ۸

۴۔ ایضاً، ص ۴

۵۔ ایضاً، ص ۴۲۱

۶۔ ایضاً، ص ۲۴۹

۷۔ شرق شناسی، ص ۱۶

۸۔ نولکھی کوٹھی، ص ۲۹

۹۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۴۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۳۱۔۳۳۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۵۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۵۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۲۷۔۴۲۸

۲۲۔ علی اکبر ناطق سے مقالہ نگار کی گفتگو، بذریعہ: فیس بک میسنجر، ۵/دسمبر ۲۰۱۶ء